امام غزالی اور علم تصوف

عذرا وقار

امام غزالیؒ (۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء۔۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء) کا پورا نام ابو حامد بن محمد غزالیؒ تھا۔ وہ اپنے دور کے مانے ہوئے استاد، عالم اور فقیہہ تھے مگر معاشرے میں ایک نمایاں مقام حاصل کرنے کے باوجود انہیں ذہنی سکون میسر نہ آ سکا۔ آخر انہوں نے اپنے لیے راہ تصوف کا انتخاب کیا اور عقل کو چھوڑ کر وجدان کو اپنا لیا۔ وہ کئی برس تک صحراؤں کی خاک چھانتے رہے اور یہیں پہنچ کر انہیں سکون قلب نصیب ہوا۔ امام غزالی نے اپنی کتاب *المنقذ من الضلال* میں اپنی جو سرگذشت بیان کی ہے وہ روحانی نشوونما کی ایک دلچسپ روداد ہے۔ اس میں وہ اپنے امتحانوں اور ابتلاؤں، اپنے شبہوں اور وسوسوں، اپنی امیدوں اور آرزوؤں اور بالآخر اپنے تاریکی سے نکل کر روشنی میں آنے کا حال سناتے ہیں۔ یعنی کس طرح انہوں نے ہر نظام فلسفے کو جو علم کی بنیاد تجربے اور عقل پر رکھتا تھا، پرکھا اور پھر تصوف کا دامن پکڑا۔ ان کے سفر کی آخری منزل توکل تھی یعنی ایک قسم کا روحانی سکون و اطمینان جس میں شک کے تھپیڑے کھانے والوں کو امان ملتی ہے۔ انہوں نے اپنے ایک دوست کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا کہ وہ اوائل عمری سے ہی اسلام کے مختلف فرقوں اور تحریکوں کو سمجھنے کی کوشش میں تھے۔ چونکہ وہ دور ہی ایسا تھا کہ اسلام کو داخلی افتراق انگیزیوں سے بچانے کی ضرورت تھی۔[1] وہ اشیاء کی اصل تک پہنچنا چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں لوگ محض بزرگوں سے سنی سنائی باتوں پر ہی اپنے اعتقادات کی بنیاد رکھتے ہیں اور خود تجربے اور مشاہدے سے نہیں سیکھتے۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہبی معاملات میں عقل کے محدود ہونے کے احساس نے انہیں شک میں ڈال دیا۔[2]

علوم و مذہب کے بارے میں غزالی کی تشکیک کوئی معمولی نہ تھی اور شوق و جستجو ایسا نہ تھا کہ رسمیات پر اکتفا کرتا اور مسلّمات کو مسلّمات سمجھ کر مان لیتا۔ انہوں نے علم و ادراک کے قریب ترین پیمانوں اور ذریعوں پر بھی تنقیدی نظر ڈالی اور ان پر عدم اعتماد کا اظہار کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ حواس ناقابل اعتبار ہیں۔[3] جیسے ایک بہت بڑے ستارے کا چھوٹا دکھائی دینا۔ صرف عقل و ریاضی ہی سے حواس کی غلطیاں معلوم ہو سکتی ہیں مگر ان کے خیال میں عقل و ریاضی کے پیمانوں میں بھی جھول تھا۔ وہ اس کوشش میں تھے کہ حقیقت یا علم اسطرح وضاحت کے ساتھ آ موجود ہو کہ شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ ان کے ذہن کا یہ الجھاؤ کہ تمام قطعیات تک مشکوک ہو گئے ہوں، دو ماہ تک رہا اور پھر وہ اپنی پہلی حالت پر آ گئے۔ یہ اس نور کی وجہ سے ہو پایا جو اللہ نے ان کے دل میں ڈال دیا تھا۔[4] یہ نور کشف ہی کا دوسرا نام ہے۔ جس کے ذریعے خدا اپنے مخصوص بندوں سے ہم کلام ہوتا ہے۔

امام غزالی کا یہ دعویٰ نہ تھا کہ رموز کائنات کا علم صرف صوفیاء تک ہی محدود ہے بلکہ انہوں نے ایک لائحہ حیات مرتب کیا جسے وہ قرب الہٰی اور مشاہدہ حق کی سعادت حاصل کرنے کے لیے صحیح خیال کرتے تھے۔ چونکہ انہوں نے اس طریقے پر جو زور دیا اس کا دارومداران کے نظریۂ کائنات پر ہے۔ اس لیے اس پر نظر ڈالنا بھی ضروری ہے، جس کی بنیادی خصائص یہ ہیں کہ ساری موجودات بلا واسطہ قادر مطلق کی تخلیق ہے۔ انہوں نے کائنات کو دو اصناف میں تقسیم کیا یعنی مرئی اور غیر مرئی۔ مرئی دنیا مادے کی دنیا ہے اور یہ دنیا ارتقاء اور تغیر و تبدل کے قانون کے تابع ہے۔ غیر مرئی دنیا جس کا ادراک انسانی حواس نہیں کر سکتے وہ دو ذیلی اصناف میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک عالم جبروت جو مادہ خالص اور روح خالص کے مابین ہے۔ وہ کلیتہً مادہ نہیں اور کلیتہً روح بھی نہیں۔ بلکہ دونوں خواص کا حامل ہے۔ قوائے فطری اس ذیلی صنف میں آتے ہیں۔ دوسرا عالم ملکوت یعنی خالص روح کا عالم، یہ عالم امثال یا عالم معنی ہے۔ روح انسانی اسی عالم کی رہنے والی ہے۔ وہ ایک شرارے کی طرح عالم مرزبوم سے آتی ہے اور اپنے جسد ارضی سے جدا ہوتے ہی جہاں سے آتی ہے وہیں واپس چلی جاتی ہے۔[۵]

یہ تقسیم امام غزالیؒ نے قرآن مجید سے آخذ کی۔ قرآن میں جو میزان مذکور ہے جس میں اعمال انسانی تولے جائیں گے، جو قلم مذکور ہے جس سے خدا کی تقدیری احکام درج کیے جاتے ہیں اور جو لوح مذکور ہے جس میں وہ درج ہوتے ہیں، ان تینوں کو معتزلہ تمثیلی اور مجازی کہتے تھے، اما اشعری انہیں واقعی اور جسمانی اشیاء سمجھتے تھے۔ امام غزالی ایک نئی روش اختیار کرتے ہیں۔ وہ انہیں عالم ملکوت (یعنی عالم امثال یا عالم معنی) کی چیزیں تصور کرتے ہیں۔ یہ تھا وہ اسلوب جس سے انہوں نے ظاہریت اور مقلدیت کو روح انسانی کی خواہش ارتقاع کے نظریے سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔[۶]

مذہب، فلسفہ اور تصوف امام صاحب کے اہم موضوع تھے، کئی مسلمان علماء اس دور میں نوافلاطونی نظریات سے متاثر تھے اور یہ اسلامی نظریات سے ٹکرا رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے یونانی منطق کے دلائل ہی کو استعمال کر کے ان نظریات کو غلط ثابت کیا۔ دوسری جانب تصوف میں ایک گروہ راسخ العقیدگی کی مخالفت کر رہا تھا اور واجب نمازوں اور دیگر فرائض سے پہلوتہی کی طرف مائل تھا۔ امام غزالیؒ نے ان دونوں باتوں کو رد کیا اور ان بدعتوں کی اصلاح کی۔ مثلاً بعض انتہا پسند صوفیوں کا عقیدہ ہے کہ جب روح انسانی کو قرب حاصل ہوتا ہے تو وہ ذات باری میں جذب ہو جاتی ہے۔ اسے وہ کبھی حلول اور کبھی اتحاد کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ مگر امام غزالیؒ نے اس وحدت الوجودی تصور کی تردید کی۔ امام صاحب نے تصوف میں راسخ العقیدگی کو رائج کیا اور دین کے ارکین پر سختی سے عمل کرنے کی تلقین کی۔

سیاسی حالات:

پانچویں صدی ہجری میں سلطنت عباسی اس قدر کمزور ہو چکی تھی کہ اس میں ماتحتوں کو قابو میں رکھنے کی سکت نہ رہی تھی اور ساری ماتحت حکومتیں اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر خود مختار ہو گئی تھیں۔ ان میں ترک پیش پیش تھے۔ وہ بڑی تیزی سے دنیا پر چھا گئے اور بہت سے اسلامی علاقے ان کے قبضے میں آ گئے۔ امام غزالیؒ نے جب ہوش سنبھالا تو انہیں ترکوں میں سے سلجوقی خاندان کا دور دورہ تھا۔ سلجوقیوں کا سب سے پہلا بادشاہ طغرل بیگ تھا جس نے ۴۲۹ھ/۱۰۳۷ء میں پہلے طوس پر قبضہ کیا پھر ۴۴۷ھ میں عراق کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور ۴۵۵ھ میں سلجوقی خاندان کی بنیادیں مضبوط کر کے چل بسا۔ طغرل خان کے بعد الپ ارسلان بادشاہ ہوا۔ الپ ارسلان کے مرنے پر اس کی حکومت اس کے بیٹے ملک شاہ نے سنبھالی جو امام غزالی کا ہم عصر تھا۔[۷] اس کا وزیر نظام الملک طوس کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد سب سے پہلے وہ بلخ کے حاکم کا میر منشی مقرر ہوا اور ترقی کرتے کرتے الپ ارسلان کا وزیر بن گیا۔ اس کے مرنے (۴۶۵ھ) پر جب اس کے بیٹوں میں باپ کی قائم مقامی کے لیے جھگڑا ہوا تو نظام الملک ملک شاہ کا طرف دار تھا اور اس کی کوششوں سے ملک شاہ بادشاہ بنا اور اس نے نظام الملک کو اپنے باپ کی طرح وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز کر دیا۔ نظام الملک نے تعلیم پھیلانے میں دلچسپی لی اور اپنی جاگیر کی آمدنی سے بھی ملک میں تعلیم کے دسواں حصہ وقف کر دیا۔ بغداد میں اس نے مدرسہ نظامیہ کی بنیاد ڈالی۔ اس کا دربار عالموں، فاضلوں اور باکمال لوگوں سے بھرا رہتا تھا اور پورے ملک میں علم کے چرچے اور عالموں کی قدر و منزلت ہوتی تھی۔[۸]

اگر ہم اسلام کے مختلف عقائد کا جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام میں عقیدہ اور قانون کے چار مختلف مذاہب حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی دنیائے اسلام میں رائج تھے جو ایک دوسرے سے بڑی حد تک ممتاز تھے، اور مختلف اوقات میں حکام و عوام میں مقبول رہے ہیں۔ امام اشعری ایک اور مسلک لے کر آئے تھے۔ چوتھی صدی ہجری میں اشعریت کو دربار میں رسائی ہوئی۔ سلجوقی خاندان کے بانی سلطان طغرل کے عہد حکومت میں امام اشعری کے تابعین پر الحاد و بدعت کا شبہ ہوا اور انہیں زباں بندی اور جلا وطنی کی سزائیں دی گئیں۔ سلطان خود امام ابو حنیفہ کا مقلد اور حنفی مسلک کا سختی سے پابند تھا۔ طغرل بیگ کی وفات پر اشاعرہ کے دن بدلے اور الپ ارسلان کے تخت نشین ہوتے ہی اور نظام الملک کے عروج میں آتے ہی اشعریت کو از سر نو غلبہ حاصل ہو گیا۔ اور یونانی فلسفے اور عقلیت پرستی کے حامیوں کی مخالفت شروع ہو گئی۔

یہی وجہ تھی کہ امام غزالی کی تصنیفات کا سب سے بڑا ہدف فلسفہ تھا۔ انہوں نے دشت فلسفہ کی سیاحی بھی کی اور سائنس کے سمندر میں خواصی بھی کی، بلکہ فکر آزاد کا شوق جی پورا کر لیا پھر یکا یک انہوں نے ایک ولولے کے تحت

خود کو تصوف کے حوالے کر دیا۔ اپنی کتاب *المنقذ من الضلال* میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ کس طرح انہیں علم حاصل کرنے کا شوق تھا جس کی تلاش میں انہوں نے جگہ جگہ خاک چھانی اور ہر مضمون سے واقفیت حاصل کی کیونکہ ان کے دل میں حقیقت کو دریافت کرنے کی آرزو تھی۔ پھر ان پر تشکک نے قبضہ کر لیا اور انہوں نے دین وایمان کی بلندیوں پر، صوفیانہ ذکر وفکر اور مجاہدہ اور ریاضت میں پناہ لے کر اس سے چھٹکارا حاصل کیا۔[9] خلیفہ مستظہر باللہ بھی نہایت علم دوست اور قدر دان تھا۔ اس لیے امام صاحب سے خاص ربط رکھتا تھا۔ فرقہ باطنیہ نے جب بہت زور پکڑا تو خلیفہ مذکور نے امام صاحب کو لکھ بھیجا کہ ان کے رد میں کتابیں لکھیں چنانچہ امام صاحب نے خلیفہ ہی کے نام سے ایک کتاب کو موسوم کیا اور *مستظہری* نام رکھا۔[10] فرقہ باطنیہ قرآن کریم کی آیات میں تاویلات پیش کرنے اور نئے نئے مطالب نکالنے کے باعث معتوب تھا۔

چونکہ امام غزالیؒ کے وقت مسلمان اختلافات میں پڑ کر فرقوں اور ٹولیوں میں بٹ گئے تھے اس لیے امام صاحب نے لوگوں کو بحث ومباحثے سے ہٹا کر ان میں اصل دین کی سمجھ پیدا کی۔ عقیدوں میں جو خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں ان کو دور کیا اور اسلام کے صحیح رجحانات کی طرف لوگوں کو مائل کیا۔ اسلامی اصولوں اور اسلامی تعلیم کو اپنی کتابوں میں عقلی طور پر سمجھایا اور بتایا کہ اسلام کی کوئی بات عقل اور حکمت سے خالی نہیں۔ یونانی فلسفے سے دین میں جو گمراہیاں پیدا ہو رہی تھیں ان کو دور کرنے کے لیے اہم اور ضروری کتابیں لکھیں۔ اس کے علاوہ اسلامی اخلاقیات پر بھی کتب تحریر کیں۔

انہوں نے مختلف فرقوں کے اعتقادات واعمال پر تحقیق کی۔ اس سلسلے میں وہ ان تمام فرقوں کے نمائندوں سے ملاقات کرتے اور ان سے بحث ومباحثہ کرتے۔ ان فرقوں کے اندر رائج مختلف غلط قسم کے خیالات کو رائج دیکھ کر وہ بہت کڑھتے اور ان کے ناقص خیالات پر دکھ کا اظہار کرتے۔ وہ یقین محکم کی تلاش میں تھے۔ اسلام میں حقائق الامور کی تلاش حضرت محمد ﷺ کی اس دعا سے شروع ہوئی جس میں انہوں نے کہا کہ اے خدا مجھے اشیاء کو ویسے ہی دکھا جیسے وہ حقیقت میں ہیں۔ یہ ایک معرفت کی بات ہے جس کا تعلق اشیاء کی حقیقت یا اندرونی معنی سے ہے۔

حالات زندگی:

وہ خراسان کے ایک گاؤں طوس میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے چنانچہ ان کی اور ان کے بھائی احمد غزالی کی پرورش ان کے والد کے ایک دوست نے کی اور ابتدائی تعلیم بھی دلوائی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد امام صاحب طوس کے ایک مدرسے میں داخل ہو گئے اور احمد بن رشکانی سے تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد مرجان گئے اور امام ابونصر اسماعیلی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔[11] اس کے بعد وہ نیشاپور چلے گئے۔

اس زمانے میں اگرچہ تمام ممالک اسلامیہ میں علوم وفنون کے دریا بہہ رہے تھے۔ایک ایک شہر بلکہ ایک قصبہ مدرسوں سے معمور تھا۔ بڑے بڑے شہروں میں سینکڑوں علماء موجود تھے اور ہر ایک عالم کی درسگاہ بجائے خود ایک مدرسہ تھی لیکن ان سب میں دو شہر علم وفن کے مرکز تھے۔نیشاپور اور بغداد، اور عراق کے تمام ممالک میں دو بزرگ استاد الکل تسلیم کیے جاتے تھے۔یعنی امام الحرمین اور علامہ ابو اسحٰق شیرازی اور یہ دونوں بزرگ انہی دونوں شہروں میں درس دیتے تھے۔نیشاپور چونکہ قریب تھا اس لیے امام صاحب بیس برس کی عمر میں نیشاپور گئے اور مدرسہ نظامیہ میں امام الحرمین کی شاگردی اختیار کرلی۔ جہاں سے انہوں نے الہیات، فقہ، سائنس، فلسفہ، منطق اور تصوف کی تعلیم حاصل کی اور اپنے استاد کی وفات (۱۰۸۵) تک وہیں رہے۔اپنی تعلیم کے اختتام پر وہ امام الحرمین کے نائب کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔جب وہ نیشاپور سے روانہ ہوئے تو ان کی عمر اس وقت اٹھائیس برس تھی اور علمی فضیلت میں لاثانی تھے۔

اس دور میں مدرسوں میں جو علوم پڑھائے جاتے تھے وہ زیادہ تر فقہ، اصول فقہ اور مذاہب کے تقابلی جائزے سے متعلق ہوتے۔ چنانچہ بحث ومناظرے کے اکھاڑے جمتے اور فضیلت اور علمی معیار ہی یہ رہ گیا کہ کون کس کو پچھاڑ سکتا ہے۔جو شخص زور تقریر سے حریفوں کا منہ بند کر دیتا وہ سب سے ممتاز سمجھا جاتا۔امام غزالیؒ کو بھی ان مراحل سے گذرنا پڑا جس سے ایک طرح کا پندار اور ترفع ان میں پیدا ہو گیا اور جس کی صراحت انہوں نے اپنی تحریروں میں کی۔جب سلاطین اور وزراء کے درباروں میں بحث کی باقاعدہ محفلیں جمتی ہوں اور کامیابی پر خلعت وانعام کی بارش ہوتی ہو تو کون دامن بچا سکتا ہے۔نیشاپور میں قیام کے دوران سلاطین سلجوقیہ وعباسیہ سے ان کے روابط استوار ہوئے اور وہ امام صاحب کی قدر کرنے لگے۔ان کے عقائد کے اثرات یورپ تک پہنچے اور یہودی ونصرانی علوم پر اثر انداز ہونے لگے۔[۱۲]

امام غزالی نے نیشاپور سے نکل کر نظام الملک کے دربار کا رخ کیا۔ چونکہ ان کی علمی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی، نظام الملک نے نہایت تعظیم وتکریم سے ان کا استقبال کیا، اس وقت فضیلت اور کمال کا طریقہ علمی مناظرات تھے، رؤسا وامراء کے دربار میں بھی علماء اور فضلاء کا مجمع ہوتا تھا اور مسائل علمی پر مناظرانہ گفتگوئیں ہوتی تھیں۔اس طریقہ کو اس قدر وسعت ہوتی کہ بڑے بڑے شہروں میں مناظرہ کی مجلسیں قائم ہوتی تھیں۔یہاں تک کہ رفتہ رفتہ مناظرہ خود ایک فن بن گیا۔نظام الملک کے دربار میں امام غزالی نے مناظروں میں شرکت کی اور مختلف مضامین پر بحثیں رہیں۔ہر موقعہ میں امام صاحب غالب رہے۔اس کامیابی نے امام صاحب کی شہرت کو چمکا دیا اور تمام اطراف میں اس کے چرچے پھیل گئے۔[۱۳]

اصفہان اور بغداد اسلامی حکومت کے دو بڑے مراکز تھے۔دونوں درباروں میں امام صاحب محترم سمجھے جانے لگے۔مدرسہ نظامیہ اپنے وقت کا سب سے بڑا دارالعلوم تھا۔بڑے بڑے عالم اس کی صدر مدرسی کی تمنا کرتے

تھے اور اس سے وابستگی کو باعث فخر سمجھتے تھے۔ چنانچہ نظام الملک نے ان کو مدرسہ نظامیہ بغداد کی مسند درس کے لیے منتخب کیا۔ اس وقت امام صاحب کی عمر چونتیس برس تھی۔ ان کے درس میں تین سو مدرسین اور سو کے قریب امراء ورؤسا حاضر ہوتے تھے۔ درس کے علاوہ خود بھی وعظ فرماتے تھے اور چونکہ یہ علمی لحاظ سے اعلیٰ درجے کے ہوتے تھے اس لیے ان کو ساتھ ساتھ قلمبند کیا جاتا تھا۔ اس طرح ایک سو تراسی وعظ قلمبند کئے گئے اور ان کا مجموعہ دو ضخیم جلدوں میں تیار ہوا۔ امام صاحب نے اس مجموعے پر نظر ثانی کی اور اس نے *مجالس غزالیہ*[۱۴] کے نام سے شہرت پائی۔

قیام بغداد کے دوران ان کا رتبہ مدبران سلطنت کے برابر ہوگیا اور لوگ ان سے سیاسی معاملات میں مشورے کرنے لگے۔ انہیں ایک عالم فقہ کی حیثیت سے تمام شان وشوکت تو مل گئی مگر بہ باطن وہ بحران کا شکار ہو گئے کیونکہ انہیں فقہ کے مباحث کے کھوکھلے پن کا احساس ہونے لگا۔ متکلمین کو وہ مقلد سمجھتے تھے جن کے علمی مسائل لفظی مباحث پر مشتمل تھے اور جن کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے فقہ کی درس وتدریس کے پیشے کو ترک کر دینے کا فیصلہ کیا۔ اس کی غالباً یہ وجہ بھی تھی کہ اس پیشے کے ساتھ اس دور میں کچھ مسائل وابستہ تھے۔ جیسے فقہا حضرات بے دین حکمرانوں کے مددگار بن گئے تھے اور شرعیہ کے قوانین سیاسی زندگی کی رہنمائی نہ کر رہے تھے۔ اس دوران انہوں نے محسوس کیا کہ بحث ومناظرہ طرح طرح کے اخلاقی ونفسیاتی عوارض کو جنم دیتے ہیں۔ انہیں معلوم ہوگیا کہ فتنے کیسے اٹھتے ہیں اور گمراہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی نظر میں وسعت پیدا ہوئی اور طبعیت مناظروں سے اچاٹ ہوگئی۔

امام غزالیؒ نے اپنے دور کے فقہا پر اپنی کتاب *احیاء علوم الدین* میں جا بجا اعتراضات کیے ہیں۔ ان کی باہمی چپقلش، ان کی حرص وآزار ودربار سلطانی میں باریابی کی سازشوں اور کوششوں کی نشاندہی کی ہے اور بتایا ہے کہ ان وارثان دین نے زر طلبی کی دوڑ میں کن کن اصولوں کو پامال کیا اور اپنے جاہ وثروت کی ہوس سے مغلوب ہو کر کن کن مقاصد کی تذلیل کی ہے۔ انہوں نے لکھا کہ فقہ کے معنی بدل دئے گئے تھے۔ اب فتوؤں کے عجیب فروعات اور ان کی علتوں کے حقائق کو جاننا اور ان میں بہت سی گفتگو کرنی اور جو اقوال ان سے متعلق ہوں ان کو یاد کر لینا گویا فقہ کہلاتا تھا اور جو ان باتوں پر غور کرتا تھا فقیہہ کہلاتا تھا حالانکہ پہلے زمانے میں اس کے یہ مطلب نہ تھے۔ اسی طرح مناظرہ کرنے والے بھی طرف ثانی کے اقوال پر اعتراضات کر کے سمجھتے تھے کہ وہ دین الٰہی کی خدمت کر رہے ہیں۔

امام غزالیؒ کی نگاہ میں اسلامی معاشرے کے زوال کی کئی وجوہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ علمائے وقت آزادی اور دلیری کے ساتھ لوگوں پر ان کی برائیاں واضح کرنے کی جرأت نہ رکھتے تھے۔ کیونکہ ان کی اکثریت نے کھانے کمانے کے دوسرے ذریعے اور پیشے چھوڑ دئے تھے اور بادشاہوں اور امیروں کے تنخواہ دار بن گئے تھے۔ امیروں اور بادشاہوں کی تنخواہوں نے ان کی زبانیں بند کر دی تھیں۔ وہ رعایا پر ان کے مظالم کو دیکھتے اور زباں تک نہ ہلاتے،

کیونکہ ان کے لبوں پر سونے کے تالے پڑے ہوئے تھے اور علماء تقلید اور روایت کا سہارا لیے ہوئے تھے۔ خود امام صاحب نے عنفوان شباب میں ہی تقلید ترک کر دی تھی۔ جو تمام مذاہب میں صحیح العقیدگی کا معیار ہے۔ تقلید ترک کرنا اور اپنی فکر کی اقلیم میں ذاتی رائے کے ایک نئے راستے پر چل نکلنا ایک ایسا کام ، جسے تمام زمانوں اور تمام مذہبوں میں تحکم پیشہ علمائے دین نے ایک گناہ کبیرہ قرار دیا ہے۔ سنی مذہب میں صحیح العقیدگی کے معنی تھے فقہ کے ائمہ اربعہ سے کسی ایک کے اصولوں کی پیروی کرنا۔ امام غزالیؒ نے قابل تعریف جرأت سے کام لے کر ذاتی تحقیق کے بغیر کسی تحکمی مسلک کا اتباع کرنے سے انکار کر دیا۔ بہر حال چونکہ انہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو شافعی کہا اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ وہ شافعی مسلک کی کم وبیش پیروی کرتے تھے۔[15]

امام صاحب نے فقہ میں بحث ومباحثہ کو اس کا جزو ماننے سے انکار کر دیا۔ یہی سلوک انہوں نے علم کلام کی عقلی موشگافیوں سے بھی کیا وار اس رجحان کی خاص طور پر مذمت کی کہ عوام کے مذہب کو منطقی طور پر ثابت شدہ عقائد کی شکل میں پیش کیا جائے۔ اس معاملے میں وہ اپنے فقہی مسلک کے بانی امام الشافعی کے پیرو تھے۔ متکلمین کی مخالفت بھی انہوں نے ان کے تعصب کی بنا پر کی۔ امام صاحب کی تعلیم یہ تھی کہ جو لوگ اسلام کے بڑے بڑے اور بنیادی اصولوں پر متفق ہیں وہ سب کے سب مسلمان ہیں۔ انہوں نے خود فلسفے کا مطالعہ کیا اور جانا کہ مذہب کو سمجھنے کے لیے محض منطق کافی نہیں اور بنیادی سچ تک اس کے ذریعے پہنچنا محال تھا۔[16] مذہبی معاملات میں عقل کے محدود ہونے کے احساس نے انہیں شک میں ڈال دیا اور ان کا ذہنی سکون برباد ہو گیا۔ ان کو اپنے درس وتدریس کے معاملات میں دوروئی ان کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی اور انہیں لگا کہ وہ بددیانتی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔[17]

اپنے دور کے فلسفیوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ کچھ مسلمان علماء نے جو خود کو بہت ذہین سمجھتے تھے خود کو مذہب سے دور کر لیا تھا۔ وہ مذہب کے مثبت احکام کا مذاق اڑاتے تھے اور حیات بعد الموت پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ ایک تو اس لیے کہ وہ غیر اسلامی معاشرے میں پیدا ہوئے دوسرے بیکار مباحث میں الجھے رہنے کے باعث انہوں نے یونانی حکماء کا نام سن رکھا تھا اور ان کے پیروکاروں کی پھیلائی ہوئی غلط باتوں کے باعث غلط فہمی کا شکار تھے اور سمجھتے تھے کہ ان کی ہر بات حرف آخر تھی۔ اور وہ انہیں اصولوں کے ذریعے سچائی تک پہنچ سکتے تھے۔ مذہب کی ان کی نظر میں کوئی مسلم حیثیت نہ تھی۔ چنانچہ ان فلسفیوں کے نقطہ نظر کو غلط ثابت کرنے کے لیے انہوں نے یہ کتاب لکھنے کا فیصلہ کیا۔[18] انہوں نے لکھا کہ اس کے علاوہ اس کتاب میں قدیم فلسفیوں کے صحیح عقائد بھی پیش کیے جائیں گے یعنی یہ کہ وہ بھی ایک خدا اور روز آخرت پر یقین رکھتے تھے اور یہ کہ عقیدے اور علم میں صرف تفصیلات کا فرق ہے اور قدیم فلسفیوں نے کبھی بھی مذہبی اصولوں کا انکار نہیں کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ فلسفے کی رسائی مطلق تک ناممکن ہے کیونکہ محض

فکر کی بنا پر یہ ممکن ہی نہیں۔ انہوں نے محسوس کیا کہ کچھ مسلمان علماء مذہب اور فلسفے کے خیالات کو باہم آمیز کر رہے تھے جس سے معاشرے میں بدامنی پیدا ہو رہی تھی۔ ان کی دو کتابیں 'المنقذ' اور 'احیاء علوم' اسی زوال کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ بہرحال بغداد میں چھ برس تک معلمی کے پیشے سے وابستہ رہنے کے بعد انہوں نے اتنی شہرت پالی کہ مملکت کے گوشے گوشے سے ہر طبقے کے طلباء، دینیات، الٰہیات، اور منطق کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ان کے پاس آتے، مگر ۴۸۴ھ کے آخر میں وہ اس پیشے سے دل برداشتہ ہو کر بغداد سے چلے گئے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ امام غزالی اپنے پڑھائے جانے والے تعلیمی نصاب سے مطمئن نہ تھے۔ اس وقت وہ جس مضمون کے بارے میں بات کر رہے تھے وہ فقہ کی مختلف نوع کے بارے میں تھا۔ زیادہ تر توجہ شرعی قوانین اور شرع کے دوسرے شعبوں کی تشریح پر دی جاتی تھی جن کا کوئی علمی استعمال نہ تھا اور یہ تمام علوم انسان کو ایک اچھی زندگی گزارنے کے لیے تیار نہ کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مدرسی کا پیشہ ترک کر دیا۔[19] امام صاحب کا اصلی کارنامہ یہ نہیں کہ انہوں نے فلسفے کی تردید کی، باطنیت کی سیہ کاریوں کو بے نقاب کیا اور فقہا کے جمود و ظاہریت کے خلاف سینہ سپر ہوئے بلکہ اصلی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے دور کے علوم وفنون اور مذاہب وافکار پر قناعت نہیں کی بلکہ اپنے تجربے، مجاہدہ اور کشف سے یہ جاننے کی جدوجہد کی کہ ان کی حقیقت کیا ہے۔

تصوف کی طرف رجحان:

امام صاحب خود لکھتے ہیں کہ انہوں نے جب اپنے حالات پر غور کیا تو سمجھا کہ وہ دنیاوی مسائل میں بری طرح پھنس چکے تھے اور ان کی بہترین سرگرمی درس وتدریس تھی جس میں وہ ایسی تعلیم دے رہے تھے کہ جو غیر اہم اور بے کار تھی۔ ان کا اپنا مقصد معلمی سے خدا کی خدمت نہیں بلکہ بااثر عہدہ اور شہرت حاصل کرنا تھا اور انہیں ڈر تھا کہ اگر انہوں نے اپنے حالات کو نہ بدلا تو وہ جہنم میں جائیں گے۔ اسی طرح وہ تذبذب میں رہے۔ ایک دن دنیاوی شان و شوکت کو چھوڑنے کا فیصلہ کرتے تو اگلے دن پھر اس کی خواہش دھاوا بول دیتی۔ چھ ماہ وہ اسی تذبذب میں رہے۔ وہ پڑھانا چاہتے تھے مگر الفاظ ان کے منہ سے نہ نکلتے۔ حتیٰ کہ وہ کچھ کھانے اور نگلنے کے قابل نہ رہے چنانچہ انہوں نے خدا کے حضور پناہ مانگی۔ انہوں نے دولت، اولاد، دوستوں، عہدے، شہرت، سب کچھ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور مشہور کرا دیا کہ وہ مکہ معظمہ جا رہے ہیں مگر ان کا ارادہ شام کی طرف جانے کا تھا۔ اعراق کے مذہبی علما کے اندر چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ ان کے گمان میں بھی نہ تھا کہ امام صاحب کی کنارہ کشی کے پیچھے کوئی مذہبی بنیاد ہوگی۔ بیرون اعراق لوگوں نے سمجھا کہ غالباً وہ حکمرانوں کی طرف سے بدسلوکی کے اندیشے کے باعث سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جا رہے ہیں۔ حکمرانوں کے قریبی لوگوں نے سوچا کہ شاید وہ اسلامی دنیا پر زوال کا ایک شاخسانہ تھا۔ بعض نے سمجھا کہ وہ فرقہ باطنیہ کی طرف

سے جان کے خوف کے باعث ایسا کر رہے تھے۔

بعد ازاں اس دور کے فقہا و علماء کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے میری زبان سے سکوت کی گرہ اٹھا دی اور گفتگو کا ہار میرے گلے میں ڈال دیا، مجھ کو وہ بات کہنی پڑی جس پر تو مواظبت کرتا ہے یعنی حق صریح سے آنکھیں بند کر کے باطل کی نصرت اور جہل کی تعریف میں اصرار کرتا ہے اور اگر کوئی شخص خلق کی رسموں سے تھوڑا نکلنا چاہتا ہے یا رسم کی پابندی کو چھوڑ کر علم کے بموجب عمل کرنے پر راغب ہوتا ہے اس توقع سے کہ نفس کی صفائی اور قلب کی درستی جس کو اللہ تعالیٰ نے عبادت مقرر کیا ہے حاصل ہو اور تمام عمر رائیگاں جانے کی تلافی سے ناامید ہو کر اپنے بعضے گناہوں ہی کا تدارک کرے اور ان لوگوں سے منحرف ہو، جن کے حق میں صاحب شریعت جناب فخر المرسلین فرماتے ہیں: اشد الناس عذا بالیوم القیمہ، عالم لا لم ینفعه اللّٰه سبحانه بعلمه رتو اس شخص پر شور اور فتنہ اٹھاتا ہے۔[۲۰]

انہوں نے اپنی جائیداد میں سے اپنی بیوی بچوں کے لیے کچھ حصہ چھوڑ کر باقی سب تقسیم کر دی اور بغداد سے شام چلے گئے اور تنہائی میں ذہنی اور روحانی سکون کے ساتھ عبادات میں مشغول ہو گئے۔ دو برس تک وہ دمشق کی ایک مسجد میں قیام پذیر رہے۔ پھر یروشلم چلے گئے۔ وہاں سے حج پر گئے اور گیارہ برس تک مقدس مقامات کی زیارتیں کرتے رہے اور صحرا نوردی میں مشغول رہے۔ ۱۱۰۵ء میں وہ واپس طوس آ گئے۔ اس عرصے میں انہیں بے شمار، عمیق تجربات ہوئے اور وہ راسخ العقیدگی کے راستے پر واپس آ گئے انہوں نے اپنے ضخیم کتاب 'احیائے العلوم دین' لکھی۔ اس دوران نہ صرف وہ لکھتے رہے بلکہ وقتاً فوقتاً پڑھاتے بھی رہے۔ اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے وہ بدعت اور الحاد کے خاتمے اور اسلام کی اصل سچائی اور اخلاقی طاقت کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہے اور اس طرح انہوں نے ایک اخلاقی اور مذہبی مصلح کا روپ اختیار کر لیا۔ انہوں نے حدیث کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور اس کو تعمیر و روحانی ہدایت کے لیے استعمال کیا۔

امام غزالی عقیدے اور عقل کے درمیان موازنہ کرتے رہے تھے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مذہب کو عقل کے بجائے وجدان اور واردات کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے حواس کے علم سے دلیل کی طرف اور دلیل سے وجدان کی طرف سفر کیا۔ یعنی جیسے استدلال سے حواس کی مہیا کردہ معلومات کو رد کیا جا سکتا ہے اسی طرح ماورائے حواس و عقل کی حالت دلیل کو رد کرتی ہے۔ جیسے خواب کی دنیا کو حواس اور عقل مسترد کرتے ہیں۔ امام غزالیؒ اس حالت کو کشف

وذوق کہتے ہیں۔جس کا تجربہ صوفیاء کرتے یں۔ان کی خواہش تھی کہ علم کے نظام میں علم حاصل کرنے کی انسانی قوتوں کو ان کا صحیح مقام دیا جانا چاہیے اور فکر اور وجدان کے درمیان صحیح رشتہ قائم ہونا چاہیے۔انہوں نے یونانی فلسفے ومنطق کے دلائل کو اس کے خلاف استعمال کر کے یہ ثابت کیا کہ عقل کے ذریعے اصل حقیقت تک پہنچنا مشکل تھا۔عقل کے ذریعے صرف انسانی حقیقتوں تک ہی پہنچا جا سکتا تھا۔[۲۱]

امام غزالیؒ 'المنقذ' میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی میں دوبارہ تصوف کی طرف مائل ہوئے کیونکہ دوسرے علوم انہیں مطمئن نہ کر سکے۔جب وہ طوس پڑھتے تھے تو جس شخص کو ان کے والد نے ان کا سرپرست بنایا تھا وہ صوفیانہ ذہن رکھتے تھے اور امام غزالیؒ انہیں اپنے خواب سنایا کرتے تھے۔ان کے علاوہ ان کے استاد الرضکانی بھی صوفیانہ ذہن رکھتے تھے۔چنانچہ الغزالیؒ ابتدا میں ایسے لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے رہے جو صوفیانہ خیالات رکھتے تھے مگر اس نوعمری میں وہ تصوف کے میدان کو چھوڑ کر اسلامی علوم اور فلسفہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔اپنے شک کے زمانے گذر جانے کے بعد انہیں خدائی روشنی ملی اور وہ کچھ بنیادی اصول ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے۔۱۰۹۵ء کے نئے دور میں انہوں نے تصوف میں علم اور عمل دونوں ملے۔انہیں سمجھ آئی کہ خدا اور رسول پر ایمان، قیامت پر ایمان، خوف خدا، خواہشات کی تہذیب، دنیاوی عارضی زندگی سے منہ موڑ کر ہمیشگی کی طرف سفر کرنا اور خدا کے قریب ہونا ہی اصل زندگی ہے۔

علم طریقت کے بارے میں امام غزالیؒ لکھتے ہیں کہ:

> یہ وہ نور ہے جب دل اپنی بری صفتوں سے صاف اور پاک ہوتا ہے یہ اس پر ظاہر ہوتا ہے اور نور سے آدمی پر بہت سے باتیں منکشف ہوتی ہیں۔جن کے پہلے وہ نام سن کر کچھ معنی نکال لیتا ہے، اب اس نور کے باعث اس سب کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔یہاں تک کہ اس وقت میں خدائے پاک کی ذات کی معرفت حقیقی حاصل ہوتی ہے اور اس کے صفات، اسکی افعال کی، اور دنیا اور آخرت کے پیدا کرنے میں حکمت کی اور وجہ آخرت کو دنیا پر مرتب کرنے کی معرفت واقعی آ جاتی ہے اور نبوت اور نبی کے معنی اور وحی اور ملائکہ اور شیاطین کے معنی اور انسانوں سے شیطانوں کی عداوت کی کیفیت اور نبیوں کو فرشتوں کے معلوم ہونے کی صورت اور ان کے پاس وحی پہنچنے کی حقیقت اور آسمانوں اور زمین کے ملکوت کی حالت اور دل کی معرفت اور اس کے اندر فرشتوں اور شیطانوں کے لشکروں کے مقابلہ کی کیفیت اور فرشتے کے اشارے اور شیطان کے خطرہ میں فرق کی شناخت اور آخرت اور جنت اور دوزخ اور عذاب قبر اور پل صراط اور میزان اور حساب کی پہچان اور خدا تعالی کی بقا اور اس کو دیکھنے

کے معنی اور اس کے نزدیک ہونے اور اس کے ہمسایہ میں جا اترنے کی غرض، سب باتیں اس نور کے سبب معلوم ہوتی ہیں۔ اس سے خدا کی صفات پر شک کی گنجائش نہیں رہتی اور حق واضح ہو جاتا ہے اور یہ امر انسان کے جوہر میں ہو سکتا ہے بشرطیکہ آئینہ دل پر دنیا کی خباثتوں کی زنگ کی تہیں نہ جم گئیں ہوں۔ اگر انسان شہوتوں سے باز رہے اور انبیاء علیہم اسلام کا اقتداء کرے تو اس کا دل جتنا صاف: دگا اور حق اتنا واضح ہوتا جائے گا۔ ۲۲

یہ وہ علوم ہیں جو کتابوں میں نہیں لکھے جاتے اور جس شخص کو خدائے تعالیٰ یہ علم عنایت کرتا ہے وہ اس کا ذکر دوسروں نے نہیں کرتا صرف جو اس کے اہل ہیں ان سے کہتا ہے اور وہی اس کے شریک مذاکرہ اور اسرار کے طور پر ہوتے ہیں اور یہی وہ علم پوشیدہ ہے جس کو جب وہ بولتے ہیں تو اللہ تعالیٰ پر مغالطہ کھانے والوں کے سوا اور کوئی اس سے جاہل نہیں رہتا۔ ۲۳

امام غزالیؒ کے خیال میں علوم اولیاء اور انبیاء اور علماء اور حکما میں فرق یہ ہے کہ علم اولیاء و انبیاء کا تو اس دروازے سے ہوتا ہے جو عالم ملکوت کی طرف کھلا ہوا ہے اور علم و حکمت کا علم حواس سے حاصل ہوتا ہے۔ اولیاء کی توجہ قلب کی تطہیر، صفا و جلا کی طرف رہتی ہے یہاں تک کہ اس میں امور حق چمکنے لگتے ہیں۔ جبکہ علماء نفس علوم کو حاصل کرتے ہیں اور اس کو دل کی طرف کھینچتے ہیں۔ بہر صورت علم قلب میں کسی طرح حاصل ہو قلب مومن فنا نہیں ہوتا۔ بعض قلوب کو مکاشفہ سے علوم حاصل ہوتے ہیں بعض کو اکتساب سے اور تعلیم سے۔ درجات اولیاء انبیاء اور علماء اور حکماء کے مختلف ہیں اور ان درجات ترقی کی کچھ انتہا نہیں۔ اس لیے کہ معلومات الٰہی کی کچھ حد نہیں اور سب سے اعلیٰ رتبہ اس نبی کا ہوتا ہے جس پر سب حقیقتیں اکتساب و مکلف صرف مکاشفہ الٰہی سے بہت جلد منکشف ہو جائیں اور اسی سعادت سے بندہ کو خداوند پاک سے قرب معنوی اور حقیقی اور وصفی ہوتا ہے۔ مگر قرب مکانی اور نزدیکی میں مسافت نہیں ہوتی اور ان درجات میں ترقی کرنی سالکین الی اللہ کی منزلیں کہلاتی ہیں۔ اور ان منازل کی کچھ حد نہیں بلکہ ہر سالک کو جس منزل پر وہ پہنچتا ہے اس کا اس کے نیچے کی منزلوں کا حال معلوم ہوتا۔ جو منزلیں اس کے آگے ہیں ان کو علماً تو نہیں جانتا مگر کبھی ایماناً بالغیب ان کی تصدیق کرتا ہے جیسے ہم نبوت اور نبی پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کے وجود کی تصدیں کرتے ہیں مگر حقیقت نبوت کو سوائے نبی کے دوسرا نہیں جانتا۔ جو علوم دلوں سے پوشیدہ رہتے ہیں خدا کی طرف سے بخل اور روک کی باعث نہیں بلکہ اس خبث اور کدورت کی وجہ سے جو دلوں میں رہتی ہے۔ جب دل غیر اللہ سے مشغول رہے گا اس میں معرفت نہیں جا سکے گی۔ انسان کا رتبہ جانور اور فرشتوں کے درمیان ہے۔ اس لیے انسان باعتبار غذا اور نشو و نما کے سبزہ ہے اور حس و حرکت اختیاری کی جہت سے حیوان اور صورت قد و قامت کے اعتبار سے مثل نقش دیوار ہے لیکن

خاصیت اس کی حقائق اشیاء کی معرفت ہے۔ پس جس شخص نے اپنے اعضاء قوی سے اسطرح کام کیا کہ علم وعمل میں اس کی استعانت ہو تو ایسا شخص فرشتوں کے مشابہہ ہے، حدیث شریف میں ہے:

اگر شیطان بنی آدم کے دلوں کے گرد نہ پھرتے ہوتے تو آدمیوں کو آسمان کے فرشتے اور اسرار دکھائی دیتے۔[۲۴]

امام غزالیؒ خدا سے محبت کو سب مقامات سے بلند مقام دیتے ہیں کیونکہ ادراک محبت کے بعد کے تمام مقامات اس کا ثمر ہیں اور محبت سے پہلے کے تمام مقامات محبت کے مقدمات ہیں۔ مگر محبت الٰہی پر ایمان لانا مشکل ہے یہاں تک کہ بعض علماء اس کے امکان سے ہی انکار کرتے ہیں کیونکہ محبت اپنی جنس کے ساتھ ہوسکتی۔ چنانچہ وہ لوگ محبت کے ساتھ ساتھ دوسرے مقامات جو لوازم محبت ہیں، سے انکار کر بیٹھے۔ خدا خود کہتا ہے کہ وہ خود اپنی مخلوق سے محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں۔ مگر بغیر اس معرفت وادراک یعنی علم کے بغیر محبت نہیں ہوسکتی۔[۲۵]

طوس واپس آ کر امام صاحب نے خود کو عبادات میں مشغول کرلیا۔ پھر نظام الملک کے بیٹے فخر الملک نے انہیں نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ میں پڑھانے کی پیشکش کی جسے انہوں نے کچھ تذبذب کے بعد قبول کرلیا مگر جب ایک فدائی کے ہاتھوں ۵۰۰ھ میں فخر الملک قتل ہوگیا تو وہ اپنے آبائی شہر طوس میں واپس آ گئے۔ اس وقت وہ اڑتالیس برس کے تھے۔ انہیں جس شے کی تلاش تھی وہ مل گئی تھی یعنی خدا کا علم اور روح کا سکون۔ انہوں نے اپنے شاگردوں کے لیے ایک مدرسہ اور اپنے مریدوں کے لیے ایک خانقاہ بنوائی اور یہاں درس وتدریس اور لکھنے کا کام کرنے لگے۔ انہوں نے دینی تعلیم کے سلسلے میں اصل نقص کو بھانپ لیا اور یہ جان لیا کہ آج کے علماء میں حرص وآز کی جو فراوانی اور دین سے حقیقی وسچی محبت کا فقدان ہے اس کا واحد سبب ان کی روحانی وباطنی تعلیم کا نہ ہونا تھا۔[۲۶] انہوں نے اس نقص کے ازالے کا باقاعدہ اہتمام کیا اور تعلیم وارشاد کے دوگونہ فرائض انجام دیے اور یہیں پر ۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء میں وفات پاگئے۔

تصنیفات:

امام صاحب نے بہت سے علوم وفنون پر کتابیں لکھیں لیکن تخصیص کے ساتھ جن علوم کو ترقی دی وہ فقہ، اصول فقہ، کلام اور اخلاق ہیں۔ شبلی نعمانی[۲۷] نے ان کی اٹھہتر (۷۸) کتابوں کی فہرست دی ہے جن میں سے چار کتابیں ان کے خیال میں امام صاحب کی نہیں ہوسکتیں کیونکہ ان کا انداز تحریر یا موضوع امام صاحب کا نہیں۔ ان کی سب سے مشہور کتاب احیاء علوم الدین، ایک ضخیم کتاب ہے جسے انہوں نے فلسفے ومذہب دونوں مضمونوں کو ترتیب دے کر تصنیف کیا ہے اور اصلاح باطن اور تزکیۂ نفس اس کے موضوعات ہیں۔ اس کے دیباچے میں وہ خود لکھتے ہیں کہ انہوں نے دیکھا کہ حق تمام عالم پر چھا گیا ہے اور سعادت اخروی کی راہیں بند ہوگئی تھیں۔ علما جو دلیل راہ تھے زمانہ ان سے خالی ہوتا جاتا تھا۔ جو رہ گئے تھے وہ نام کے عالم تھے جن کو ذاتی اغراض نے اپنا گرویدہ بنالیا تھا اور جنہوں نے تمام عالم کو یقین دلایا کہ علم صرف تین چیزوں کا نام ہے مناظرہ، وعظ وپند

اور فتوے دینا۔ باقی آخرت کا علم تمام عالم سے ناپید ہو چکا تھا۔ چنانچہ ان کی تصنیفات کا مقصد یہی تھا کہ لوگوں کی توجہ ناقص اور قابل مذمت علوم سے ہٹا کر قابل تعریف اور صحیح علوم کی طرف لگائی جائے تا کہ وہ ان سے فائدہ حاصل کر کے اپنی زندگیوں کو بہتر طریقے سے گذار سکیں۔

اختتامیہ:

امام غزالیؒ اپنے دور کے مانے ہوئے استاد، عالم اور فقیہہ تھے۔ مگر معاشرے میں اتنا اونچا مقام پانے کے باوجود ان کا دل مطمئن نہ تھا۔ انہوں نے اپنے دور کے تمام متداولہ علوم حاصل کیے اور مناظرانہ بحثوں میں کمال حاصل کیا۔ یہاں تک کہ اس میدان میں وہ تمام معاصرین سے آگے نکل گئے۔ پھر بھی وہ کسی اور منزل کے متلاشی تھے۔ فلاسفہ کے درمیان علم حاصل کرنے کے ذرائع مثلاً حواس، عقل اور روایت وغیرہ کے مصدقہ ہونے پر بحث بہت پرانی ہے۔ اسلامی دور میں بھی مختلف فرقوں میں اس موضوع پر بحث جاری تھی کہ کسی علم کے درست ہونے کے بارے میں انسان حتمی رائے کیونکر قائم کر سکتا ہے۔ خصوصاً یہ مسئلہ کہ خدا کے وجود کے بارے میں حتمی علم کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ تمام بڑے بڑے صوفیاء کرام کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ ہر طرح کے کتابی علوم حاصل کرنے کے بعد پھر اس سے آگے کی منزل کے لیے کوشاں ہوتے ہیں۔ امام غزالیؒ نے بھی اس مقام پر پہنچ کر تمام علوم جن کا ذریعہ حواس، عقل یا روایت تھے، کے ناقص ہونے کو محسوس کیا اور اعلانیہ ان ذرائع کے خلاف بغاوت کر دی۔ بعد ازاں انہوں نے کشف یا وجدان کو اعلیٰ تر سمجھتے ہوئے اس پر بھروسہ کیا اور صوفیاء کے طریقے کو اپنایا اور اسی کو درست خیال کرتے ہوئے آخر دم تک ایک صوفی بن کر رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصنیفات تمام صوفیاء کرام کی طرح انسانی ذہن و روح کا گہرا نفسیاتی مطالعہ بن کر سامنے آتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ مولانا محمد حنیف ندوی، افکار غزالی علم و عقائد (لاہور، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۴۴ء) ص ۴۸۔

۲۔ سید امیر علی، روح اسلام، مترجم محمد ہادی حسین (لاہور، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۸۸ء) ص ۶۵۹۔

۳۔ W. Montgomry watt, Muslim intellectual; A Study of Imam Ghazali, (edinburg University press,1971) p.23.

۴۔ مولانا محمد حنیف ندوی، ایضاً، ص ۵۱ تا ۵۴۔

۵۔ سید امیر علی، ایضاً، ص ۶۷۲۔

۶۔ ایضاً، ص ۶۶۰۔

۷۔ اعجاز الحق قدسی، امام غزالی (لاہور، فیروز سنز، ۱۹۷۱ء) ص ۳۰۔

۸۔ ایضاً، ص ۲۳۔۲۴۔

۹۔ سید امیر علی، ایضاً، ص ۶۲۵۔۶۳۵۔۶۴۱۔

۱۰۔ شبلی نعمانی، حوالہ سابقہ ص ۴۱۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۶

۱۲۔ مولانا محمد حنیف ندوی، ایضاً، ص ۳۲۔

۱۳۔ مولانا شبلی نعمانی، ایضاً، ص ۳۵۔۳۶۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۱۔

۱۵۔ امام غزالی، احیاء علوم الدین، (مترجم مولانا احسن نانوتوی)، جلد اول، (لاہور، مکتبہ رحمانیہ، ت۔ن) ص ۳۵۔۳۶

۱۶۔ سید امیر علی، حوالہ سابقہ، ص ۶۶۱۔

۱۷۔ M.M. Sharif. *A History of Muslim Philosophy*, (Karachi, Royal book Company,1983),p 592.

۱۸۔ Imam Ghazali, Tahafut Al-Falasifah,Introduction,(Lahore, The Philosophical Congress,1958).

۱۹۔ سید امیر علی، ایضاً، ص ۴۴۱۔

۲۰۔ امام غزالی، احیاء علوم الدین، جلد اول، ایضاً، ص ۱۱۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۳۷۔۳۸۔

۲۲۔ ایضاً، ایضاً، ص ۱۸۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۹۔

۲۴۔ ایضاً، جلد چہارم، ایضاً، ص ۴۶۸۔۴۷۲۔

۲۵۔ سید امیر علی، ایضاً، ص ۶۶۵۔

۲۶۔ مولانا محمد حنیف ندوی، حوالہ سابقہ، ص ۷۷۔

۲۷۔ شبلی نعمانی، حوالہ سابقہ، ص ۷۴۔۹۴۔